تعلیم معاشرے کی ذمہ داری

جب بھی انسان اور معاشرے کی بات کی جاتی ہے تو قدیم و جدید دانشوروں اور فلسفیوں کی مختلف آراء ہمارے سامنے آتی ہیں، سبھی کا خلاصہ یہی نکلتا ہے کہ ''انسان ایک معاشرتی حیوان ہے'' مشرق و مغرب کے مفکرین یہی کہتے سنائی دیتے ہیں، اس میں کیا حقیقت ہے، آیئے غور کرتے ہیں۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ لفظ حیوان یہاں اپنے وسیع تر حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے، اور وہ ہے زندگی، قرآن حکیم میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے،

وَمَا هَٰذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ ۚ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۚ (العنکبوت:۶۴)

''یہ دنیا کی زندگی تو محض دل کا بہلاوا اور کھیل ہے، آخرت کا گھر ہی اصل زندگی ہے (کاش کہ) وہ یہ جان لیتے''

اس اعتبار سے یہ لفظ کسی بھی ذی حیات کے لیے بولا جانے لگا جس میں نباتات و حیوانات، چرند پرند، جن و بشر سب شامل ہیں۔ عرب دنیا کے ایک عظیم ادیب اور دانش ور جاحظ نے حیاتیات پر جو انمول کتاب لکھی ہے اس کا نام ہی ''الحیوان'' ہے۔ جب کہ عرف عام میں ہمارے ہاں یہ لفظ جانور کے لیے استعمال ہوتا ہے جو عقل و شعور سے تہی دامن سمجھا جاتا ہے، اسی وجہ سے بہت سے لوگ اس تعبیر پر اعتراض کرتے ہیں کہ انسان کو حیوان کیوں کہا گیا، حالانکہ حیوان کا معنی جانور نہیں ہے جاندار ہے۔

اور ہم جب اپنی کائنات کے جانداروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو دیگر مخلوقات کے مقابلے میں زیادہ بہتر اور اچھے انداز میں مل جل کر رہتا ہے، یہ اس کی ضرورت اور مجبوری بھی ہے اور اس کی فطرت کا تقاضا بھی۔

معاشرہ کیا ہے؟

مل جل کر، منظّم انداز میں اس طرح رہنا کہ سب کی ضرورتیں بھی پوری ہوں اور کوئی کسی پر زیادتی اور ظلم نہ کرنے پائے۔ اسی انداز حیات کو معاشرتی زندگی کہا جاتا ہے، اس اعتبار سے صرف اکٹھا رہنا، معاشرہ نہیں ہے جیسے جانوروں کے غول، حشرات کے گروہ، اور درختوں کے جھنڈ۔ بلکہ ایسے ربط ضبط سے رہنا کہ جس میں جذبوں اور شعور کی قربت بھی ہو اور بدنی ضرورتوں کو پورا کرنے میں باہمی مدد اور تعاون بھی۔ سب ایک دوسرے کے حقوق و فرائض کا ادراک بھی رکھتے ہوں اور انہیں پورا کرنے کی کوشش بھی کرتے ہوں۔

انسان ہی سب سے بہتر معاشرہ قائم کرسکتا ہے۔

ایک بہترین اور اچھا معاشرہ قائم کرنے کے لیے انسان سے بہتر کوئی اور مخلوق نہیں ہے۔ اس لیے کہ خالق انسان نے اسے جن صلاحیتوں اور خوبیوں سے نوازا ہے وہ کسی اور کے پاس نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ انسانی دنیا میں مسلسل ترقی اور ارتقاء ہو رہا ہے۔ اور یہ ترقی و ارتقاء ہمہ پہلو اور ہمہ گیر ہے، جانوروں اور نباتات کی دنیا جب سے وجود میں آئی ہے اس میں کوئی خاص اور قابل ذکر ترقی دکھائی نہیں دی۔ اگر نباتات و حیوانات کے رنگ، شکل اور ذائقے میں کچھ تبدیلی رونما ہوئی ہے تو وہ بھی انسانی شعور کا کمال ہے جس نے زمان و مکان کی تبدیلیوں کے پیش نظر، اپنی ضرورتوں کے مطابق یہ کارنامے انجام دیے اور مسلسل دیے چلے جا رہا ہے۔ دنیا بھر کے جانور غذا، لباس، اور جذبات کے اظہار کے اعتبار سے اپنی جبلّت کے پابند ہیں، نہ وہ اس میں تبدیلی لا سکتے ہیں اور نہ ہی ان میں اس کا شعور ہے۔ دنیا بھر میں رہنے والے سب جانور صرف اپنی اپنی

بولی بول سکتے ہیں، کسی دوسرے جانور کی بولی نہ اپنا سکتے ہیں، اور نہ خود اپنی بولی میں کوئی کمی بیشی کر سکتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے کچھ نہیں سیکھتے، اس لیے ان کی دنیا بہت ہی محدود چھوٹی سی، سمٹی سمٹی رہتی ہے۔ جبکہ انسان کی فطری بے قراری اور تلاش وجستجو، ترقی وکمال کی چاہت، ہر پل ہر لمحے کچھ نیا کرنے پر آمادہ رکھتی ہے۔ غذا میں، دوا میں، لباس میں، مکان میں، غم وخوشی کے اظہار میں، زبان و بیان میں... سب میں نئے نئے رنگ بھرتا رہتا ہے۔ لیکن وہ یہ سب کام اکیلا اور تنہا نہیں کر سکتا، سب کو سب کے ساتھ مل کر کام کرنا پڑتا ہے، ہر ایک دوسرے کا دست و باز و بنتا ہے، یہ اس کی فطرت بھی ہے اور مجبوری بھی۔

انسانی معاشرہ ترقی کے راستے پر کیسے چلا؟

مشرق ومغرب کے بہت سے دانش وروں کا خیال ہے کہ انسان حیوانی زندگی سے ارتقاء کرتا ہوا آگے بڑھا ہے۔

☆ انسانی تاریخ بیان کرنے والوں نے جب یہ کہا کہ انسان جب اس زمین پر ظاہر ہوا تو مکمل طور پر گنوار، جنگلی اور اجڈ تھا۔ اسے لباس، غذا، دوا معاشرتی رشتوں کے تقدس کا کچھ علم نہیں تھا، نظریات اور عقائد تو اس کے قریب سے بھی نہیں گزرے تھے۔ وہ اپنی ذات کے حوالے سے مختلف تجربات سے گزرتا رہا اور کچھ نہ کچھ سیکھتا رہا، بالآخر اسے لباس کے حوالے سے درخت کے پتوں، جانوروں کی کھال، پھر کھال کے بالوں سے لباس بنانے کا شعور ملا اور بات حریر و ریشم تک جا پہنچی، دوا اور غذا میں بھی مختلف تجربات سے گزرتا ہوا آج کی حالت تک پہنچا ہے اور ابھی اس کا سلسلہ جاری ہے۔

کئی حوالوں سے تو یہ تصور بالکل درست ہے لیکن عقل وفکر اور شعور وآگہی کے کئی مراحل ایسے ہیں جن کے اعتبار سے یہ بات درست نہیں ہے۔

کچھ لوگوں نے اس کے برعکس رائے دی اور کہا کہ نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ ابتداء میں انسان کا خاندان چھوٹا سا تھا۔ افراد بہت کم تعداد میں تھے اس لیے بڑی محبت اور امن وآشتی سے رہتے تھے۔ آبادی میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور ان کے درمیان مفادات کی جنگ اور دوڑ شروع ہوگئی تو اس کی بناء پر آپس میں لڑائیاں، قتل وغارت گری، فساد کا آغاز ہوا اور یہ مسلسل بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن اگر ہم یہاں ہلکا سا ٹھیر کر دیکھیں تو اس میں صرف آبادی کی کثرت ہی فسادات اور اختلافات کا سبب نہیں تھی بلکہ چند افراد بھی اگر موجود تھے تو اس میں بھی فرد کی ذاتی پسند ناپسند، اپنی ذاتی چاہت اور ناچاہت فساد کا سبب بنتی رہی ہے، سب سے پہلا قتل آبادی کی کثرت کی بناء پر نہیں بلکہ اپنی ذاتی چاہت میں دوسرے پر غالب ہونے کی خواہش کے پیش نظر ہوا۔ ہابیل اور قابیل نے اپنی ذاتی ضرورت اور چاہت کی بنیاد پر قتل کے اس سلسلے کو شروع کیا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ جانوروں میں بھی لڑائی باہمی مفادات کے ٹکراؤ کی وجہ سے ہوتی ہے گویا محض مفادات کی وجہ سے لڑائی جانوروں کا طریقہ ہے، انسان اس معاملے میں بہت مختلف ہے۔

اور ایک تیسرا تصور جو ہمیں آسمانی تعلیمات سے ملتا ہے وہ یکسر مختلف ہے۔ آسمانی علم یہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں آنے والا سب سے پہلا انسان جاہل، اجڈ اور گنوار نہیں تھا بلکہ علم وعرفان سے مزیّن تھا، اسے علم الأسماء سے نوازا گیا تھا اور یہ علم خالق انسان نے براہ راست اسے عطا کیا، لیکن اس معرفت اور علم کی حیثیت ایسی ہی تھی جیسے کسی درخت کے بیج کی، کہ بیج کے اندر پورے درخت کو اپنی تمام کیفیات اور صلاحیتوں کے ساتھ سمیٹ دیا جاتا ہے۔ درخت کی قامت اور ہیئت، شاخوں، پتوں، پھولوں، پھلوں کے رنگ، ذائقے، شکل کی ساری تفصیلات اس بیج کے دل میں لکھ دی جاتی ہیں، اور پھر اسے زمین وزماں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ جہاں وہ بیج ہفتوں، مہینوں یا کئی سال کی مشقتوں کے بعد ثمر آور درخت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

اسی طرح نسل انسانی کا شجر (جسے ہم شجرہ نسب بھی کہتے ہیں) اس بیج سے شروع ہوا جس میں علم وحکمت کو بھر دیا گیا تھا، اس لیے پہلا انسان جاہل اور گنوار نہیں تھا، اسے اپنی، اپنے خالق کی اور دشمن کی پہچان عطا کی گئی تھی۔ البتہ مادی ضروریات کے اعتبار سے اسے وہ ابتدائی علم

دے دیا گیا تھا جو اس کے لیے ضروری تھا اور اس کے بعد انسان نے اپنے خالق کی عطا کردہ صلاحیتوں کو اپنی ضرورتوں اور حالات کے مطابق استعمال کرنا شروع کر دیا جس میں ترقی کا عمل ابھی تک جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ خالق انسان نے اس کی ذہنی اور مادی ارتقاء کا سارا سامان انسان کو زمین پر اتارنے سے پہلے ہی کر دیا تھا تاکہ اس کی زندگی بہتر سے بہترین کی طرف سفر کرتی رہے، البتہ روحانی اعتبار سے جس علم کی ضرورت تھی وہ روز اوّل ہی سے کامل و اکمل شکل میں عطا کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ زمین پر پہلا انسان جس کا ذکر تمام آسمانی کتابوں میں ملتا ہے وہ نبی اور رسول تھا جسے بندگیٔ رب سے پہلے معرفت رب سے نوازا گیا اور پھر یہی مقصدِ تخلیق جن و بشر ٹھیرا

وَمَاخَلَقْتُ الجنَّ و الاِنْسَ اِلّا لِیَعْبُدُون　　(الذّاریٰت:56)

''میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔''

آدم علیہ السلام سے لے کر محمد صلی اللہ علیہ وسلّم تک تمام انبیاء اسی ایک مقصد کی یاد دہانی کے لیے دنیا میں تشریف لاتے رہے اور بندوں کو اللہ کی بندگی پر آمادہ کرتے رہے۔

بہتر معاشرہ کیسا ہوتا ہے؟

مشترکہ مفادات

معاشرہ کا معنی ہم جان چکے ہیں کہ باہم مل جل کر رہنا معاشرت کہلاتا ہے اور انسان اپنی ضرورتوں اور صلاحیتوں کے اعتبار سے بظاہر مختلف گروہوں میں بٹا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن سب ایک دوسرے کے محتاج ہونے کے ناطے سے باہم جڑے ہوئے بھی ہیں۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ جہاں بھی افراد کے مفادات میں اشتراک پایا جائے گا وہیں قربت اور ربط ضبط میں آسانی ہوگی۔ اس لیے گھر، خاندان، اہل محلّہ اور پھر پیشوں اور صلاحیتوں کے اعتبار سے لوگ ایک دوسرے کے قریب رہتے ہیں۔ اساتذہ، ڈاکٹرز، کسان، تاجر، انجینئرز، ماہرین قانون، انتظامیہ، اسی طرح مختلف ہنر رکھنے والے افراد آپس میں میل ملاپ رکھتے ہیں اور آسانی سے باہمی معاملات طے کر لیتے ہیں۔ اس اعتبار سے مشترکہ مفادات باہمی معاشرت کا ایک بنیادی سبب ہے۔

اعلیٰ اقدار

سوچنا یہ ہے کہ کیا محض مشترکہ مفادات کا ہونا اچھے معاشرے کی ضمانت ہوسکتا ہے؟ اس بات کو اگر ہر پہلو سے دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ مشترکہ مفادات بعض اوقات خرابی اور فساد کا سبب بھی بن جاتے ہیں۔ اگر چور، ڈاکو، خیانت کار، دنگا فساد مچانے والے، رشوت خور اپنے اپنے مفاد کے لیے منظّم ہونا شروع ہو جائیں تو زمین فساد سے بھر جائے گی۔ اس لیے مشترکہ مفادات کے ساتھ ساتھ معاشرے کو اعلیٰ اقدار کا حامل بھی ہونا چاہیے۔

اعلیٰ اقدار کا تعیّن سب سے پہلے خالق انسان نے کیا اور اس کے بعد انسانی تجربات نے بہت کچھ سکھایا۔ اعلیٰ اقدار کی بنیادی پہچان یہ ہے کہ وہ سب کے لیے مفید ہوتی ہیں، سب کی راحت اور آسانی کا خیال کیا جاتا ہے، جس بات اور کام سے انسان پریشان ہو جائے، اور اسے اذّیت و تکلیف پہنچے یا جس کی وجہ سے کسی کے حقوق مارے جائیں تو ایسی بات یا کام ''اچھی قدر'' نہیں ہوسکتا اور جہاں یہ صورت پائی جائے تو وہ معاشرہ بہتر معاشرہ نہیں کہلائے گا۔

باہم متعاون

اچھا معاشرہ باہمی تعاون کے اصول پر چلتا ہے، اگر کسی مقام پر ایک ہی خاندان یا پیشے سے تعلق رکھنے والے لوگ رہتے ہیں لیکن وہ آپس میں متعاون نہیں ہیں، مشکل میں ایک دوسرے کا ہاتھ نہیں بٹاتے، غمی، خوشی کے ساتھی نہیں بنتے تو وہ معاشرہ بھی اچھا معاشرہ نہیں ہے۔ اس لیے ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونا، اپنی کہنا اور دوسرے کی سننا اور مخلصانہ انداز میں اپنا تعاون پیش کرنا ہی اچھے معاشرے کی علامت ہوسکتی ہے۔

ترقی پذیر

اچھا معاشرہ ہمیشہ ترقی کے راستے پر گامزن رہتا ہے۔اس لیے چند افراد کا ذاتی اعتبار سے ترقی کر جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ پورا معاشرہ اپنے اندر رہنے والے سارے افراد کو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے میں مددگار ثابت ہو رہا ہے۔ایک ایسی اجتماعیت ہے جس میں کوئی شخص اپنی چالاکیوں سے دوسرے کا حق نہ مارے اور کوئی شریف النفس بغیر کسی وجہ کے پیچھے نہ رہ جائے۔اس لیے اچھا معاشرہ اجتماعی طور پر بہتری کی طرف گامزن رہتا ہے اور کسی قسم کی طبقاتی تقسیم کا شکار نہیں ہوتا۔

ایک اچھا معاشرہ آج جس حالت میں ہے آنے والے کل میں اسے مزید بہتر ہونا چاہیے۔

ہر اچھائی کو قبول کرنا اور ہر خرابی کو دور کرنا

ایک اچھا معاشرہ ہمیشہ، ہر اچھائی قبول کرتا ہے، اسے اپناتا ہے۔اس معاشرے میں رہنے والے لوگ اچھی بات، اچھی فکر، اچھے ہنر، اچھے کام کی تلاش میں رہتے ہیں۔انہیں حکمت کی بات جہاں سے ملے حاصل کر لیتے ہیں، نہ ان کے ہاں جدید و قدیم کی کشمکش ہوتی ہے اور نہ علاقائی، نسلی اور لسانی عصبیت۔اسے تو بس اچھائی سے غرض ہے۔یہی وجہ ہے کہ کبھی مغرب والوں نے مشرق سے سیکھا اور کبھی مشرق والوں نے اہل مغرب سے۔مسلمانوں کے لیے یونان اور ہند کی حکمتیں کام آئیں اور اہل یورپ نے مسلمانوں سے علم و حکمت سیکھا۔اس لیے اچھے معاشرے کے لیے داخلی، خارجی، اور فاتح و مفتوح کا مسئلہ نہیں بلکہ اچھا اور برا اصل مسئلہ ہوا کرتا ہے۔

آج تک اور آئندہ بھی۔جن معاشروں نے دوسروں کی خوبیاں اپنائی ہیں اور خرابیوں سے اجتناب کیا ہے وہی معاشرے ترقی پا سکے ہیں وگرنہ عصبیت کی تنگ گلیوں میں رہنے والے بالآخر کور چشمی کا شکار ہو گئے ہیں۔

اب ہم معاشرے اور تعلیم کی بات کرتے ہیں۔بعض نادان یہ سمجھتے ہیں کہ تعلیم کا عمل استاد، تعلیمی ادارے، نصابی کتب، طالب علم اور بعض تعلیمی وسائل کے استعمال سے مکمل ہو جاتا ہے۔اور بعض کے خیال میں کچھ چیزوں کو یاد کر لینا، ذہنوں میں محفوظ کر لینا اور پھر اسے دوسرے افراد تک منتقل کرنے کا عمل ایک سائیکل کی طرح چلاتے رہنا بس یہی تعلیم ہے۔تو یقیناً وہ تعلیم کے ایک جزو کو جانتے ہیں اور دوسرے اجزا سے ناواقف ہیں۔

تعلیم — چند معلومات کو یاد کر کے یا سمجھ کے دوسروں کو یاد کروا دینے یا سمجھا دینے کا نام نہیں ہے بلکہ انسان کو صحیح اور غلط کی تمیز سکھاتے ہوئے اسے عملی زندگی میں کامیاب فرد بنانا ہے۔اور پھر ان افراد کو باہم اس طرح مربوط کر دینا ہے جیسے جسم کے سب اعضاء-سب اپنا اپنا کام بھی کرتے ہیں لیکن ہر ایک دوسرے کی بھلائی چاہتا ہے اور اسے اپنا پورا تعاون مہیّا کرتا ہے، اس لیے تعلیم، فکر و خیال کے نکھار کے ساتھ معلومات میں ترقی، اور ان کی روشنی میں بہتر معاشرہ قائم کرنا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے بجا فرمایا ہے:۔

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوزِ جگر ہے علم ہے سوزِ دماغ

(ضرب کلیم ۷۹)

گویا سوزِ دماغ کو سوزِ جگر سے منسلک کر کے ہی تعلیم کے مقاصد حاصل کیے جا سکتے ہیں اور جب یہ دونوں اکٹھے ہو جائیں تو انسان تعلیم کو بدنی ضروریات کو پورا کرنے کے دائرے سے بڑھا کر معرفت ذات اور مقصد زندگی کو پورا کرنے کے وسیع تر میدان میں لے آتا ہے۔لیکن جو لوگ صرف مادی ضروریات کو پورا کرنے کے چکر میں اسے محدود دائرے میں قید کر لیتے ہیں، وہ اپنی معلومات اور ہنرمندی کی وجہ سے اچھی ملازمت یا کام حاصل کرنے ہی کو اصل کامیابی سمجھ بیٹھتے ہیں۔جس کے نتیجے میں مال و دولت، عزت و شہرت اور اختیار و اقتدار ہی اصل مقصد بن

جاتا ہے، ایسے علم کے بارے میں علامہ محمد اقبال کا فرمان ہے۔

علم میں دولت بھی ہے، قدرت بھی ہے لذّت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ

(ضربِ کلیم ۷۹)

جب تک فرد اور معاشرہ کو اپنا سراغ یعنی اپنی اصل پہچان حاصل نہیں ہوگی علم کا مقصد ادھورا رہے گا، اور جسے اپنی پہچان حاصل ہو جاتی ہے وہ اپنے خالق اور رب کی پہچان تک بھی رسائی حاصل کر لیتا ہے اور معاشرے کو ایسے ہی اہلِ نظر کی ضرورت ہے جو انسان کو — انسان، کائنات اور ربّ کائنات کی پہچان کروائیں۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہو رہا۔

اہلِ دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہلِ نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ

(ضربِ کلیم ۷۹)

اگرچہ دانش کی اپنی اہمیت و افادیت ہے یعنی اس سے زندگی میں روشنی آتی ہے اور انسان کے دائرہ نظر میں اس روشنی کی بدولت وسعت آتی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ اُسے نظر بھی چاہیے۔ یہ بصارت کی نہیں بلکہ بصیرت کی بات ہے جس کے ذریعے انسان مستقبل کے دھندلکوں میں جھانکنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

گویا اہلِ نظر وہ ہیں جو بات کی گہرائی کو دیکھتے ہیں اور اس کے اصل نتائج پر غور کرتے ہیں اور ان نتائج کو زندگی کے ایک ایک لمحے پر نافذ کرتے ہوئے فوری طور پر معاملات اور مشکلات کا حل تلاش کرتے ہیں۔

کیونکہ اگر دانش ہے، نظر نہیں ہے تو سمجھ لیجیے کہ علم کا پیمانہ بھرا نہیں خالی رہ گیا ہے۔

شیخِ مکتب کے طریقوں سے کشادِ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

(ضربِ کلیم ۷۹)

اس میں علامہ نے درحقیقت اس معلم کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے جو وسعتِ نظر سے خالی ہے، چاہے وہ معلم سکول کا ہو یا کالج، یونیورسٹی کا یا پھر دینی مدرسے کا۔ علامہ کہتے ہیں کہ اس کے پاس دل کی کشادگی اور وسعتِ نظر کہاں ہے؟ وہ تو ابھی تک ماچس کی ڈبیا ہاتھ میں لے کے بیٹھا ہے اور ماچس کی ڈبیا سے بجلی کا بلب کیسے جلایا جا سکتا ہے۔ یقیناً بجلی کا بلب سائنس کے آگے بڑھنے کی طرف اشارہ ہے اور کبریت یعنی ماچس کی ڈبیا زندگی کی ابتدائی کیفیت کی طرف اشارہ ہے جب انسان نے ابھی توانائی کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا۔ علّامہ ایسے معلم، شیخ مکتب اور ملّا پر تنقید کرتے ہیں جو زندگی کے حقائق کو وسیع تر نظر سے نہیں دیکھتے۔ نہ وہ زمانے کے تقاضوں سے واقف ہیں اور نہ انسانی معاشرے کو ترقی یافتہ اور حسنِ اخلاق سے مزیّن معاشرہ بنانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ علّامہ فرماتے ہیں کہ میں نے ان اساتذہ کے ہاں جا کر دیکھا جو ایک محدود دائرے میں چھوٹی سی چار دیواری کے اندر بیٹھے ہوئے، اسی طرح تنگ نظریے کے ساتھ پڑھانے کے عمل میں مصروف ہیں، میں جب ان کے پاس گیا تو کیا دیکھتا ہوں

دلِ ملّا گرفتارِ غمے نیست
نگاہے ہست درچشمش غمے نیست

(ارمغانِ حجاز ۹۶)

’’میں نے ملاّ (استاد) کے دل میں کوئی غم نہیں دیکھا، اس کے پاس نگاہ ہے لیکن اس کی آنکھوں میں غم نہیں ہے‘‘۔ اس کی بندش صرف یہ ہے کہ یہ کتاب، اس کتاب کے صفحات کتنے ہیں اور مجھے کتنے عرصے میں یہ صفحات بچوں کے ذہنوں میں انڈیل دینے ہیں۔ گویا معاشرے، افراد اور انسان کا غم اس کے دل میں موجود نہیں ہے۔ وہ دیکھتا تو ہے، پر اس کی آنکھوں میں کسی کا غم موجود نہیں ہے اور جب تک غم موجود نہ ہو، کسی درد کا احساس نہ ہو، انسان کبھی بھی اگلا قدم نہیں اٹھا سکتا۔ وہ بصارت تک محدود رہتا ہے اور اس کی رسائی بصیرت تک نہیں ہو پاتی۔

از اُو مکتب از تختم اگبر از

نیست زمزمِ حجازش ریگ در کہ

(ارمغان حجاز ۹۶)

’’میں اس کے مکتب سے روتا ہوا اٹھ گیا کیونکہ میں نے دیکھا کہ اس کے حجاز کی سرزمین پر کوئی چشمۂ زم زم نہیں ہے‘‘۔ ان کی تعلیم گاہوں میں کہیں زم زم نہیں پھوٹتا جس سے انسانوں کی روحانی، بدنی اور فکری تربیت کا صحیح اہتمام کیا جا سکتا ہو اور روح کی پیاس بجھتی ہو جس طرح زم زم کا پانی انسانوں کو سیراب کر دیتا ہے اسی طرح علم بھی انسانوں کو سیراب کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے جب ہم معاشرے کی بات کرتے ہیں تو واضح طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ تعلیم کا کام کسی تعلیمی ادارے کی چار دیواری میں مکمل نہیں ہوتا۔ وہاں تو تعلیم کا ایک حصّہ پورا کیا جاتا ہے جس کا زیادہ تر تعلق نظری معلومات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کی عملی تعبیر و تصویر تو معاشرے میں مختلف رویوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور جب ہم معاشرے پر غور کرتے ہیں تو اس کی سب سے مضبوط اور مؤثر اکائی گھر کی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔ گھروں سے محلّہ، محلّوں سے بستی، بستیوں سے شہر اور پھر بات ملکوں تک پہنچ جاتی ہے اور پھر گھر ہی سے خاندان، برادری، قبیلہ اور قوم کا تعارف حاصل ہوتا ہے۔

جب ہم گھر کی بات کرتے ہیں جہاں سے معاشرے کا آغاز ہوتا ہے اور جو اس کی سب سے اہم کڑی ہے، جہاں والدین اور بچے، سب سے بہتر تعلق، سب سے خوبصورت رشتہ، سب سے مضبوط اکائی ہے۔ اور جب ہم ماں کا نام لیتے ہیں اور یہ جملہ بولتے ہیں کہ ’’ماں پہلی درسگاہ ہوتی ہے‘‘ تو جان لیجیے یہ بالکل واضح حقیقت ہے۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ انسان جو اپنے ماں باپ سے سیکھتا ہے اور ماں باپ میں بھی جو اپنی ماں سے سیکھتا ہے، وہ زندگی کے آخری لمحات تک ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملے وہ معمول کے برتاؤ بالخصوص عمر کے اس حصے میں جب انسان کی شخصیت ابھی تکمیل کے ابتدائی مراحل میں ہوتی ہے تو وہ چند الفاظ، چند باتیں، چند پیار کے لمحات، چند کیفیتیں، انسان کی زندگی کا حصہ بن جاتی ہیں اور وہی انسانوں کے رویے بناتی ہیں۔ انسان کتنا ہی بڑا ہو جائے ماں کی نظر میں وہ چھوٹا بچہ رہتا ہے کہ جس نے ابھی چلنا سیکھنا ہو اس لیے اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ماں اپنے بچے کو الوداع کرتے ہوئے کہتی ہے کہ سڑک دیکھ کر پار کرنا اور گھر سے نکلتے ہوئے آیت الکرسی پڑھ لینا، چاہے وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو گیا ہو۔ ماں کا یہ جملہ انسان کو ایک نئی لذت اور رہنمائی دیتا ہے اور پھر دل کرتا ہے کہ آیت الکرسی پڑھ بھی لی ہے تو اب دوبارہ پڑھ لوں۔ کیونکہ یہ اللہ کے رسول نے تو کہا ہی ہے لیکن اس کا پیغام اب ایک اور ہستی کی طرف سے مل رہا ہے جس کے بارے میں اللہ کے رسولؐ ہی نے کہا کہ ’’سب سے پہلا حق ماں کا ہے اور اس کے بعد بھی حق ماں کا ہے اور اس کے بعد بھی حق ماں کا ہے اور اس کے بعد باپ کا حق ہے۔‘‘

یہ بات جب وہاں سے آتی ہے تو اس کا اپنا ایک خاص اثر دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی دوسرے شہر میں رہتے ہوئے اپنی ماں کو فون کر کے کہے کہ میں کل آ رہا ہوں تو اس ماں کو ساری رات نیند نہیں آئے گی کہ کل اس کا بیٹا آنے والا ہے، چاہے اس بیٹے کی عمر ۶۰ سال کیوں نہ ہو۔ ماں باپ کا بچوں کے ساتھ ایسا تعلق ہے کہ اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اگر ماں سمجھ دار اور تعلیم یافتہ ہے (ان دونوں لفظوں کو الگ الگ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ بے شمار مائیں تعلیم یافتہ ہیں لیکن سمجھدار نہیں ہیں، اور بے شمار مائیں سمجھدار ہیں لیکن تعلیم یافتہ نہیں ہیں) اور اگر سمجھداری اور تعلیم دونوں اکٹھی ہو جائیں تو پھر سونے پہ سہاگہ اور چار چاند لگنے والی بات میسر آ جاتی ہے۔

ماں جو بلاواسطہ تعلیم دیتی ہے، بچے جو براہ راست ماں سے سیکھتے ہیں کھانے پینے سے لے کر لباس کے پہننے اور پہنانے تک، ماں کا اپنے بچوں کیساتھ پیار کا انداز کیا ہوتا ہے؟ کس طرح سے ہوتا ہے؟ بات کرتے وقت ماں کا لہجہ کیا ہوتا ہے؟ کون سے لفظ اختیار کرتی ہے اور کس مناسبت سے بولتی ہے۔ بچے کی کسی حرکت پر ماں کا ردعمل کیسا ہے اور کیسا نہیں ہے؟ وہ ماں جو صبح سے لے کر رات تک اور رات کے آخری لمحات تک اپنے بچوں کے بارے میں یہ جانتی ہیں کہ ان کے کھانے کے اوقات کیا ہیں اور باقاعدہ اس کا لحاظ کرتی ہیں کہ ان کے لباس میں کون سی چیزیں اس کے بدن کو زیادہ آرام پہنچا سکتی ہیں۔ اس کے بارے میں اس کو جاننا، بچے کی غذا میں کون سی چیز اس کے لیے بہتر ہو سکتی ہے اس کے بارے میں اس کو جاننا، وہ الفاظ جو پکارنے کے لیے بولے جاتے ہیں کہ ایک ماں جب اپنے بچے کو آواز دیتی ہے تو کیسے دیتی ہے؟ کوئی حکم دیتی ہے تو کس طرح دیتی ہے؟ یہ تمام باتیں یقیناً قابلِ غور ہیں اور یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی تعلیم کا باعث بنتی ہیں۔

بچے اور کہانیاں

کہانیوں کے انتخاب میں اگر ذرا سی کوشش کر لی جائے تو کتنا بڑا انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔ ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں ماں باپ اور بڑی بہنیں اپنے چھوٹے بہن بھائیوں یا اپنے بچوں کو دیو، بھوت اور جنات کی کہانیاں سناتی ہیں اور بچپن میں ہی ایک طرح کا خوف ان میں ڈال دیتی ہیں۔ جبکہ غور کیا جائے تو بچہ ابتدائی مراحل میں اندھیرے سے نہیں ڈرتا لیکن وہ اپنے بڑوں کے جملوں کو سن سن کر اندھیرے سے ڈرنا شروع ہو جاتا ہے۔ اپنے بڑے بہن بھائیوں کو دیکھ کر ہر شے سے گھبرانا شروع ہو جاتا ہے۔ اگر اس بچے نے تاریکی سے ڈرنے کا یہ جملہ نہ سنا ہوتا تو یقیناً وہ تاریکی سے نہ ڈرتا۔ یہ محض ایک تصور ہے جو نسل در نسل آگے منتقل ہوتا رہتا ہے۔ یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ابتدائے عمر میں بچے کو بہلانے کے لیے جو کہانیاں سنائی جاتی ہیں ان میں اگر مشاہیر اسلام کے کارناموں اور ان کی قربانیوں کے قصے چھیڑے جائیں تو ماں کی گود ہی ایک بڑے سماجی انقلاب کا گہوارہ بن سکتی ہے۔

گھر کا ماحول اور بچوں کی تعلیم

بچوں پر گھر کے ماحول کا اثر ہوتا ہے۔ یہ ایسی تسلیم شدہ حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس کے باوجود اکثر گھرانوں میں اس کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ بچے اپنی انتہائی ابتدائی عمر میں ہی سیکھنا شروع کر دیتے ہیں، اس حوالے سے بعض تحقیقات تو یہ بھی بتا رہی ہیں کہ ماں کی پاکیزگی، اس کا طور طریقہ دودھ پلانے کی عمر میں ہی بچوں پر اثر انداز ہونا شروع ہو جاتا ہے اور عقل و شعور اور روّیوں کی تعمیر عمر کے پہلے سال سے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ ماں اگر بات بات پر چیختی چلاّتی ہے تو بچہ بھی ویسا ہی طرزِ عمل اختیار کرنا شروع کر دیتا ہے۔ بچوں کی ابتدائی عمر انتہائی تیز رفتاری سے مشاہدے اور سیکھنے کے مرحلے سے گزر رہی ہوتی ہے لیکن گھر کے بڑے افراد اسے بچہ سمجھ کر نظر انداز کر رہے ہوتے ہیں۔

انسان کو اللہ نے یہ صلاحیت دے رکھی ہے کہ وہ جو کچھ سیکھتا ہے اس میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ صرف نقل نہیں کرتا بلکہ تخلیق بھی کرتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ بات مشاہدے میں اکثر آئی ہے کہ بچہ کوئی ایسی بات کر دیتا ہے جو ماں باپ کی دانست کے مطابق انہوں نے کبھی نہیں کہی۔ حالانکہ انہوں نے وہ بات کسی نہ کسی انداز میں کبھی نہ کبھی ضرور کہی ہوتی ہے، جو بچے کے لاشعور میں جا کر جگہ پکڑ لیتی ہے اور پھر کسی اور موقع پر بچے کی زبان پر وہی بات کسی نئی شکل میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے یقین کر لینا چاہیے کہ بچوں کے سامنے کہی جانے والی بات یا کیا جانے والا عمل ان کے شعور کا حصہ بنتا چلا جاتا ہے اس حوالے سے خاص احتیاط کی ضرورت ہے۔

جن گھروں میں بلا لحاظ گالیاں دی جاتی ہیں، بات بات پر لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں اس کے منفی اثرات بچوں کی نفسیات اور رویوں پر پڑتے ہیں اور بہت سے گھروں میں تو یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بچوں کی زبان سے نکلنے والی گالی پر خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے، اور اسے محض

لاڈ پیار کا حصّہ بنا دیا جاتا ہے حالانکہ خود اس طرح کی حرکتوں سے باز رہنا اور بچوں کو اچھے انداز میں ٹوکنا انتہائی لازمی ہے۔

جناب عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

اَلْزِمُوا اَوْلَادَکم و اَحْسِنُوا اَدَبَھُم

''اپنے بچوں سے منسلک رہو، اور ان کو اچھے ادب آداب سکھاؤ''

یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ ماں باپ کا باہمی رویہ کیسا ہے؟ دوستانہ ہے؟ کھچاؤ والا ہے؟ یا تحکمانہ ہے؟ حاکم کون ہے؟ گھر میں باپ حاکم ہے یا ماں؟ دونوں بھی ہو سکتے ہیں یا دونوں میں جس کا داؤ چلے وہ اپنا اپنا داؤ استعمال کرتا ہے لیکن بچے ان چیزوں کو دیکھ رہے ہوتے ہیں اور غیر محسوس انداز میں والدین کے رویے بچوں کی شخصیت کا حصہ بنتے چلے جاتے ہیں۔

تغافلی رویہ: بعض اوقات جب اختلافات بڑھنے شروع ہو جاتے ہیں تو پہلا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ ignore کر دیا جاتا ہے۔ نہ بیوی خاوند کی اس کیفیت کو دیکھتی ہے، نہ خاوند بیوی کی اس کیفیت کو دیکھتا ہے۔ دونوں اپنی اپنی دنیا میں مست ہوتے ہیں اور بچے اس تغافل والے رویے سے بھی بہت منفی اثر لیتے ہیں۔ اگر والدین کا تعلق اچھا ہو تو بچے ان سے بات share کرتے ہیں لیکن تغافل کی بنا پر، دونوں کے ignore کر دینے کی بناء پر، بچے بھی اسی طرح کی سائیکی اپنا لیتے ہیں اور اسی طرح کی پریشانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی گھر میں لڑائی جھگڑے والا کوئی معاملہ ہے تو پھر سمجھ لیں کہ صرف دو افراد آپس میں نہیں لڑ رہے بلکہ ایک لڑاکا نسل تیار کی جا رہی ہے۔ جو نسل در نسل نہ جانے کہاں تک اس کا اثر چھوڑے گی۔ اس لیے علامہ اقبالؒ نے حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کو ایک ماڈل ماں، ایک ماڈل بیوی اور ایک ماڈل عورت کے طور پر پیش کرتے ہوئے یہ بات کہی کہ ''بچوں کی سیرت ماؤں کی بنیاد پر پنپتی ہے اور بچوں کے اندر صدق وصفا کی صفات ماؤں کے جوہر کی وجہ سے میسر آتی ہے اگر تسلیم و رضا کی خو کا کوئی حاصل ہے تو وہ فاطمۃ الزہراءؓ بتول ہیں۔ اور ماؤں کے لیے بھی اگر کوئی بہترین نمونہ ہیں تو وہ فاطمۃ الزہراءؓ بتول ہی ہیں''۔

بحر متاج دل اش آن گونا سوخت

با یہود چادر خود را فروخت

(ایک محتاج کے لیے ان کا دل ایسا تڑپا کہ اپنی چادر ایک یہودی کے ہاں فروخت کر دی)

یہ خوبصورت جملہ انسانی رویوں کی تعلیم ہے کہ فاطمۃ الزہراءؓ نے ایک غریب تنگ دست آدمی کو دیکھا جو محتاج تھا، لباس نہیں تھا، اب چاہا کہ اس کی مدد کی جائے۔ مدد کے لیے گھر میں کچھ موجود نہیں تھا تو اپنی ہی چادر ایک یہودی کو فروخت کر دی اور اس سے جو ملا وہ اس محتاج کو دے دیا اور کہا کہ تم اس سے اپنی ضرورت پوری کر لو۔ حسنؓ اور حسینؓ نے جب اپنی ماں میں یہ بات دیکھی ہو گی کہ گھر میں کچھ نہیں ہے لیکن پھر بھی محتاج اور ضرورت مند کی ضرورت کو پورا کر دیا گیا تو ماں نے انہیں زبان سے کچھ سکھایا نہیں بلکہ اس کا عمل ہی ان کی تعلیم و تربیت کے لیے کافی ہوا ہو گا۔

آں ادب پروردۂ صبر و رضا

آسیہ گردان لب قرآن سرا

(یہ ادب جو حضرت فاطمہؓ کے ہاں آیا، یہ صبر کی بنیاد پر اور رضا اور تسلیم کی بنیاد پر آیا یعنی ایک ہاتھ سے چکی چل رہی ہے اور زبان قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف ہے۔)

یہ وہ فاطمۃ الزہراءؓ ہیں جو اگر اپنے والد سے ذرا سا اصرار کر دیتیں تو مالِ غنیمت میں سے بہت کچھ میسر آ سکتا تھا اور ایک دفعہ آپؓ اپنے والد محترمؐ کے پاس گئیں بھی اور ان سے گزارش کی کہ مال غنیمت کے طور پر آپ کے پاس کچھ لونڈیاں اور باندیاں آئی ہیں اگر مجھے بھی کوئی

خدمت گار مل جائے تو عنایت ہو جائے گی تو والد نے کہا کہ بیٹی میں تمہیں اس سے بہتر چیز نہ سکھا دوں؟ آپؓ نے پوچھا کہ ہاں بتایئے، آپؐ نے فرمایا:

''ہر نماز کے بعد ۳۳ بار سبحان اللہ، ۳۳ بار الحمد اللہ اور ۳۴ بار اللہ اکبر کہہ دیا کرو۔ یہ تمہارے لیے غلام سے زیادہ بہتر ہوگا''۔

بیٹی سن کر واپس آ جاتی ہے اور پھر چکی کی گردش چلتی رہتی ہے۔ زندگی کے آخری لمحے تک فاطمۃ الزہراءؓ کو کبھی تکیے پر سر رکھ کر روتے ہوئے نہیں دیکھا اور تکیے پر سر رکھ کر رونا یہ درحقیقت حالات کی تنگی سے دلبرداشتہ ہونے کی علامت ہے۔ اس لیے علامہ نے کہا کہ فاطمۃ الزہراءؓ حالات کی تنگی سے دل برداشتہ ہو کر تکیے پر سر رکھ کر کبھی نہیں روئیں۔ ہاں نماز میں جب کھڑی ہوتی تھیں تو تب ان کے اشک موتیوں کی طرح ان کی آنکھوں سے ٹپکتے تھے۔

گریہ ہائے اُو زبالین بے نیاز　　گوہر افشاند بدامان نماز

اشک اُوبر چید جبریل از زمین　　ہمچو شبنم ریخت برعرشِ بریں

(جبریل امین نے فاطمۃ الزہراءؓ کے اشکوں کو موتیوں کی صورت میں جمع کیا اور عرشِ بریں پہ جا کر شبنم کے قطروں کی طرح پھیلا دیا کہ وہاں پر اس کا اثر موجود دکھائی دیتا ہے۔)

از امومت پختہ تر تعمیر ما　　در خط سیمائے اُو تصویرِ ما

یعنی ماں کی وجہ سے میری تعمیر میں پختگی آئی ہے اور اس کی پیشانی کی لکیریں میری تقدیر ہیں۔ یہ محض لکیریں نہیں ہیں جو ماں کی پیشانی پر زمانے کے ساتھ ساتھ مختلف انداز میں ظاہر ہوتی ہیں۔ یہ تو درحقیقت اس کے بچوں کی تقدیر لکھی جا رہی ہے۔ بچوں کو تعلیم و تربیت دینے کے لیے ماں کے ساتھ ساتھ باپ بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ بچوں سے اس کا رویہ کیسا ہے، باپ کے پاس بچوں کے لیے وقت کتنا ہے؟ اس میں بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں لیکن یہاں ایک ہونہار بچے کی مثال دینا چاہتا ہوں، جو اسلام آباد کا رہنے والا بہت ہونہار اور ذہین بچہ کہ اس نے ایک سال میں پورا قرآن حفظ کر لیا، لیکن بے انتہا شرارتی کہ سارے کے سارے استاد اس سے تنگ، سارے بچے پریشان۔ ایک بار اس سے پوچھا گیا کہ'' بچے! آپ ذہین ہیں، اچھی شکل والے ہیں، کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق ہے تو پھر یہ سب کیوں کرتے ہو؟'' پہلے تو وہ بات ٹالتا رہا لیکن دو چار ملاقاتوں کے بعد ایک دن اس نے اپنے اندر کی بات کہہ دی کہ'' سر میں کیا کروں؟ گھر جاتا ہوں تو کوئی بات کرنے والا نہیں ہوتا، والد صاحب اس وقت چلے جاتے ہیں جب میں ابھی سو ہی رہا ہوتا ہوں اور جب دوبارہ سو جاتا ہوں تب آتے ہیں۔ کبھی مجھ سے نہیں ملتے، ان کے پاس میرے لیے وقت ہی نہیں ہے تو میں کیا کروں؟''

یعنی وہ بچہ اپنے اندر کی مایوسی کو دور کرنے کے لیے یہ تمام شرارتیں کر رہا ہے جبکہ تنگ کرنا اس کے مزاج کا حصہ نہیں ہے۔ لیکن اس کے اندر کی مایوسی اس کا سبب تھی۔ اس لیے اگر باپ اپنے بچوں کو مناسب وقت نہیں دیتا تو بعض اوقات اس کا ردعمل اسی طرح سے ظاہر ہوتا ہے۔ احساس محرومی کے مداوے کے علاوہ شرارت کا ایک جواز یہ بھی ہے کہ بعض بچوں میں زبردست ذہانت اور کچھ کر گزرنے کی صلاحیت ہوتی ہے مگر سکول کے اندر عمل تعلیم میں اس پوٹینشل کا استعمال کرنے کا بندوبست نہیں ہوتا، لہٰذا ذہین بچے کو اپنی ذہانت کے اظہار کے لیے شرارت کی راہ اختیار کرنی پڑتی ہے۔ عام حالات میں معمولی ذہانت کے بچوں کے لیے تعلیمی سرگرمیاں ترتیب دی جاتی ہیں جو ذہین طالب علم کو پوری طرح مطمئن نہیں کر سکتیں، چنانچہ وہ شرارت کا سہارا لیتا ہے۔

بچوں کو دوست بنایئے

بچوں کی دلچسپیوں سے دلچسپی لینا، یہ یقیناً ماں باپ کی ضرورت بھی ہے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کی بھی۔ بچوں سے بات چیت کرنا، کہ اگر

کہیں مشکل ہے تو بچوں کے ساتھ بات کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ ہمارے ہاں قدیم وجدید دونسلوں میں بہت بڑا فرق آ گیا ہے اور دونوں نسلیں افراط وتفریط کا شکار ہوگئی ہیں۔ اب تک بزرگوں کی دنیا میں اکثریت ایسے افراد کی ہے جو اپنے والدین سے بات کرنا بے ادبی سمجھتے ہیں یا ان کے والدین نے یہ بات سمجھا دی کہ باپ سے بات بہت سنبھل کر کرنی چاہیے۔ اس لیے بچے اس کو بے ادبی سمجھتے ہوئے ہمیشہ سہمے اور ڈرے ہوئے رہتے ہیں یا کبھی بہت زور لگا لیا تو ماں کے پاس جا کر رو لیے لیکن باپ سے اپنے دل کی بات کرنے میں اکثر گریز کرتے ہیں۔ اس کا ردعمل کیا ہوا؟ اس کا ردعمل یہ ہوا کہ بچوں کو ماں باپ کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ ٹی وی اور ریڈیو میں بے شمار ایسے پروگرام نشر ہو چکے ہیں جس میں اس ردعمل کو ظاہر کرنے کے لیے بیٹے کو باپ کے اور بیٹی کو ماں کے سامنے کھڑا کر دیا گیا اور وہ ان سے اس طرح بات کرتا ہے جیسے کسی چھوٹے فرد سے بات کی جاتی ہے یعنی اس میں ادب واحترام بالکل ختم ہوگیا ہے۔ پہلا رویہ بھی غلط تھا اور دوسرا ردعمل بھی یقیناً غلط ہے۔ اعتدال ہی سب سے بہتر ہے کہ جہاں کہیں مشکل ہو اپنے معاملات کو بچوں کے ساتھ ڈسکس کیا جائے۔ ایسا کرنے سے خاندان کا شیرازہ بکھرنے نہیں پاتا اور بچوں میں بالخصوص اجتماعیت کا شعور پروان چڑھتا ہے اور اُنہیں غضب کا اعتمادِ ذات میسر آتا ہے۔ جب وہ سیکھتا ہے کہ اس کا والد، جسے وہ idealize کرتا ہے، اس سے مشورہ کرنا ضروری سمجھتا ہے تو اچانک اس کے دائرہ فکر میں بے پناہ وسعت آ جاتی ہے۔

بچوں کے تحفے

ایک بار ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی اس کو دیکھا کہ وہ بچوں کے لیے کھلونے خرید رہا ہے اور اسے یہ بات پریشانی کی حد تک پسند ہے کہ وہ بچوں کو کھلونے لے کر دے۔ کچھ دنوں بعد یہ بھید کھلا جب اس نے خود یہ جملہ کہا کہ ''میں جب چھوٹا سا تھا تو میرے ماں باپ نے مجھے کبھی کھلونا نہیں لے کر دیا اور یہ حسرت میرے دل میں مستقل طور پر رہی اور اب میرا دل چاہتا ہے کہ جہاں کوئی بچہ نظر آئے اس کو میں کوئی نہ کوئی کھلونا خرید کر دوں''۔

تحفے دینے میں انتخاب کی بات بھی اہم ہے۔ کچھ والدین ہمیشہ بچوں کو کتاب دیتے ہیں اور کچھ اس کے برعکس بھی ہیں جو اپنے بچوں کے ہاتھ میں کبھی کتاب دیتے ہی نہیں ہیں۔ جبکہ کتابیں اور کھلونے دونوں بیک وقت بچے کی ضرورت ہیں۔ آج کے دور میں بے شمار ایسے کھلونے دستیاب ہیں جو کھلونے تو ہیں ہی مگر ان میں تعلّم کا بھی بے تحاشہ مواد موجود ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسے کھلونوں کا اپنے بچوں کے لیے انتخاب دوررس نتائج کا حامل ہوسکتا ہے۔

بچوں کا بڑوں کے ساتھ تعلق

بچوں کی عمر کے ہر مرحلے میں بڑوں کا بچوں کے ساتھ تعلق کیسا ہے؟ اس پر بھی انسان کو غور کرنا چاہیے کہ کیا وہ تعلق آمرانہ ہے؟ اگر آمرانہ ہے تو غلط ہے۔ کیا وہ تعلق غافلانہ ہے؟ کہ چھوڑو کوئی بات نہیں، آہستہ آہستہ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ بھی غلط ہے۔ لیکن اگر وہ تعلق دوستانہ ہے تو یہ سب سے بہتر تعلق ہے کہ اس میں اپنے دل کی مشکلات کو آسانی سے share کیا جا سکتا ہے۔

کچھ تعلیم وتربیت کے معاملات ایسے ہیں جو بلا واسطہ نہیں بلکہ بالواسطہ ہوتے ہیں۔ یعنی براہ راست نہیں بلکہ indirect ہوتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ماں باپ کے پڑوسیوں سے جیسے تعلقات ہونگے بچوں کے رویے ویسے ہی ہوں گے۔ اگر تعلقات اچھے اور ہمدردانہ ہیں، دکھ سکھ میں شرکت ہو رہی ہے تو بچے وہی سیکھ رہے ہیں۔ اگر الگ تھلگ رہنے اور اپنے اوپر خواہ مخواہ کی بڑائی کا خول چڑھائے رکھنے کی صورت ہے تو بچے بھی اسی کردار کو اپنا لیں گے۔ اور اگر بات بات پر لڑائی جھگڑا، دنگا فساد والا ماحول ہے تو بچے بھی ذہنی اور نفسیاتی طور پر اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنے پرزور طریقے سے فرمایا۔ اللہ کی قسم وہ مومن نہیں- اللہ کی قسم وہ مومن نہیں- اللہ کی قسم وہ مومن نہیں- پوچھا گیا کون یا رسول اللہ؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کا پڑوسی اس کے شر سے محفوظ نہیں وہ مومن نہیں۔

ملازموں کے ساتھ برتاؤ اور بچوں کے کردار پر اثرات

یہ بات کہی جا چکی ہے کہ بچے ہر بات اور ہر کام کو غور سے دیکھتے سنتے ہیں اور پھر اس سے اچھا یا برا اثر قبول کرتے ہیں۔ جن گھرانوں میں ملازموں کو ادنیٰ اور گھٹیا درجے کا انسان سمجھا جاتا ہے اور ان سے بات کرتے وقت، یا کوئی کام کہتے وقت نازیبا لفظوں کا استعمال ہوتا ہے تو بچے اسی رویّے کو صحیح سمجھتے ہیں اور پھر اسے اپنا بھی لیتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں اپنے سے کمزور یا ماتحت فرد یا افراد کے ساتھ غلط رویہ اختیار کرنا معاشرے کی عام بات ہو جاتی ہے، پھر طبقاتی تفریق کے ساتھ ساتھ باہمی نفرت بھی پھلنا پھولنا شروع کر دیتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو کھانا تم خود کھاؤ اسی میں اپنے خادموں کو کھلاؤ۔

اس اعتبار سے گھر، دفتر، کھیت اور کارخانے میں کام کرنے والے ملازمین کے ساتھ حسن سلوک انتہائی لازمی ہے، حسن سلوک میں ان کا خیال رکھنا، ضرورتوں کو حتی المقدور پورا کرنا اور اس کے ساتھ ان کی عزّت نفس کا خیال رکھنا بھی انتہائی لازمی ہے۔

ماں باپ اور خاندان

یہ سب سے اہم بات ہے جس کو بطور خاص دیکھنا چاہیے کہ بچوں کی تربیت میں خاندان کے باہمی تعلقات کس قدر اثر ڈالتے ہیں۔ کس قدر خاندان کے عزیزوں رشتہ داروں کے بارے میں گھر میں بحث ہوتی ہے۔ شادی بیاہ کے حوالے سے اکثر دیکھا گیا ہے کہ شادی سے پہلے اور اس کے بعد رشتے ناطوں کے حوالے سے، جب گھر میں discussion ہو رہی ہوتی ہے تو بچے ان تمام باتوں کو سن کر بہت کچھ سیکھ رہے ہوتے ہیں۔ یہی غیر رسمی تعلّم آگے چل کر ان کے معاشرتی اور سماجی رویوں کی تشکیل کرتا ہے۔ اس لیے چھوٹے بچوں کے سامنے کی جانی والی گفتگو میں انتہائی سوجھ بوجھ اور احتیاط کی ضرورت ہے۔

ماں باپ اور لین دین

ماں باپ اپنے لین دین اور معاملات میں کتنے کھرے اور کتنے کھوٹے ہیں، ان سب کا اثر بھی بچوں پر پڑتا ہے۔ ایک تاجر اگر ملاوٹ کا کام کرتا ہے اور اس کام کے بارے میں گھر میں جب کوئی گفتگو ہوگی تو یقیناً بچے یہی بات سیکھ رہے ہوں گے۔ اور اب تو لوگوں نے ایسے ایسے انداز اپنا لیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو بھی فریب دینے میں وہ کوئی حرج محسوس نہیں کرتے۔ اکثر دکانداروں کو دیکھا جاتا ہے کہ جب کوئی ان سے کوئی چیز لینے جائے تو کہتے ہیں کہ ''اللہ کی قسم میں نے اتنی قیمت میں یہ چیز خریدی ہے'' اور خریدار اس کی بات سن کر اعتبار کر لیتا ہے تو بچے بھی یہی سیکھ لیتے ہیں۔ جبکہ صورتحال اس کے برعکس ہوتی ہے۔ بچے اس غلطی کو نہ صرف سیکھتے ہیں بلکہ اس کو آگے پہچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے ہمیں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ بچوں کو ناسمجھ کبھی نہ سمجھیں، وہ کسی بھی عمر کے ہوں، بچے ناسمجھ نہیں ہیں۔ البتہ اظہار کا موقع کبھی کسی کو ملتا ہے اور کسی کو نہیں ملتا۔

بچے اور آزادی

اس حوالے سے دیکھنا ہے کہ عمر اور وقت کے ساتھ ساتھ آزادی کا تصور بدلے گا۔ ابتدائی عمر یعنی لڑکپن میں، اس سے آگے جوانی اس سے مزید آگے حتیٰ کہ بچوں کی شادیاں بھی ہو جائیں تب بھی بچوں کا تعلق والدین سے رہے گا اور اس میں بھی تعلیم و تربیت کا کچھ اہتمام ہوتا رہے گا۔ اس لیے بچے جیسے جیسے بڑے ہوتے چلے جائیں گے آزادی کا تناسب بھی اسی قدر بڑھتا چلا جانا چاہیے۔ اسی اعتبار کے ساتھ بچوں کے ساتھ برتاؤ ہونا چاہیے۔ البتہ اس بات کا خیال رہے کہ آزادی اور مادر پدر آزادی میں فرق ہوتا ہے۔ اسی موضوع پر بچوں کو یہ سبق دینے کی بھی ضرورت ہے کہ آزادی کی حد وہاں تک ہے جہاں سے دوسرے فرد کی آزادی کی حد شروع ہوتی ہے۔ اس لیے ماں باپ کو اپنے بچوں پر مناسب انداز میں نگرانی کو اہمیت دینی چاہیے۔ بے جا ڈانٹ ڈپٹ سے یقیناً گریز کرنا چاہیے۔ کیونکہ بے جا سختی اور ڈانٹ ڈپٹ سے ایک لمحہ

ایسا آتا ہے کہ احترام کا حجاب پھٹ جاتا ہے، اور اگر احترام کا پردہ باقی نہ رہے تو سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ اسی حوالے سے یہ امر بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ تشدّد سے نئی نسل میں نرم رویوں کو پروان نہیں چڑھایا جا سکتا، لہٰذا ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ کے نتیجے میں بچوں کے نازک رویے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو سکتے ہیں۔ مثلاً بندوق کی نوک پر کسی کو رحم دلی اور انسانی ہمدردی کا سبق نہیں دیا جا سکتا۔ ایسی صورت میں احترام نہیں رہتا۔ یہ بہت نازک چیز ہے۔ ماں باپ اگر اپنے احترام کے حجاب کو اپنے کسی رویے کی بناء پر ختم کر دیتے ہیں یا بچوں کو ایسا موقع دیتے ہیں تو یہ یقیناً ان کی ناکامی ہے۔ سب سے کامیاب والدین وہ ہیں جو اپنے بچوں کی نگرانی بھی کرتے ہیں۔ لیکن بچوں اور والدین کے درمیان ادب واحترام اور محبت کا حجاب بھی رکھتے ہیں کہ جس میں دُوری کی بجائے قربت ہوتی ہے لیکن ایسی قربت کہ جس پر بہت ساری دوریاں قربان کی جا سکتی ہیں۔ علامہ اقبال نے ایک اور موقع پر یہ بات کہی کہ

به پور خویش دین و دانش آموز
که تابد چوں مهه و انجم نگینش
بدست اُو اگر دادی هنر را
ید بیضاست اندر آستینش

(ارمغان حجاز ۱۹۴)

(خاندان کا بڑا ہونے کے ناطے اپنے بچوں کو دین، اخلاقیات اور دانش یعنی حکمت کی باتیں سکھاؤ۔ مدرسے کا علم بھی سکھاؤ اور گھر کی حکمت ودانش کی باتیں بھی۔ اگر تم ایسا کرو گے تو اس کا نگینہ ماہ وانجم کی طرح چمکنا شروع کر دے گا۔ اگر آپ نے بچوں کے ہاتھ میں کوئی ہنر بھی دے دیا تو سمجھ لیں کہ آپ نے بچوں کو یدِ بیضا یعنی چمکتا ہوا ہاتھ (جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا) اپنے بچوں کو دے دیا۔) جس سے ہر قسم کا سحر توڑا جا سکتا ہے۔ اس لیے ماں باپ اور بچوں کے باہمی ربط کو بہت غور سے دیکھنا چاہیے۔ مستقبل کی منصوبہ بندی میں بچے اور ماں باپ آپس میں کس طرح بات کرتے ہیں یا مشورہ کرتے ہیں؟ کس کا کتنا حق ہے؟ رہنمائی کا طریقہ کیا ہے؟ یہ سب باتیں ہمارے ذہن میں آنی چاہئیں۔

والدین اور بچوں کی تعلیمی ترقی میں رہنمائی

اس رہنمائی میں مختلف مرحلے آ سکتے ہیں، جیسے بچپن کی عمر ہوگی تو روزانہ کی رہنمائی کی ضرورت پیش آئے گی۔ پھر تھوڑا اور بڑا ہوگا تو اس کی پریشانی اور مشکلات پر غور کرنا ہوگا کہ کہیں بچہ تعلیم میں پیچھے تو نہیں ہے اور اگر ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟ کیوں اس کے چہرے پر پریشانی کے اثرات نمودار ہوتے ہیں اور مزید بڑے ہو جاتے ہیں تو ماہانہ بنیادوں پر کم از کم بچوں کے ساتھ ایک دن یا چند گھنٹے مخصوص کر لیے جائیں تاکہ بچے اپنے معاملات والدین سے discuss کر سکیں۔

تعلیم وتربیت اور سماجی تنظیمیں

علاوہ ازیں معاشرے میں تعلیم وتربیت کو آگے بڑھانے کے لیے بہت سے خوبصورت انداز ہیں۔ ان میں ''طلبہ کی غیر سیاسی، علمی وادبی تنظیموں کا کردار'' نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی تنظیمیں بنانی چاہئیں، چھوٹے چھوٹے بچوں سے لے کر بڑے بچوں تک انہیں ایسی تنظیموں میں شامل کیا جائے جو علمی اور ادبی بنیادوں پر کام کرتی ہوں۔ کیونکہ اگر بچے مل کر کسی کام کے بارے میں سوچیں اور اسے علمی میدان میں لے کر آئیں تو اس سے انسان وہ کچھ سیکھتا ہے جو کسی استاد سے نہیں سیکھ پاتا۔ مل کر کوئی کام کرنے کا سلیقہ، چھوٹی چھوٹی تنظیمیں چلانا، پاکستان میں ایسے بے شمار ادارے اور تنظیمیں ہیں جو تعلیمی، ثقافتی اور تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کا کام خوش اسلوبی سے کر رہی ہیں۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے تو بچوں کے پھول سے شاہین بننے کا عمل پورا ہوتا ہے۔ اس لیے بچوں کو کسی ایسی تنظیم میں شامل کرنا چاہیے یا اگر تنظیم نہیں ہے تو خود اپنے محلے اور خاندان کے بچوں کو مل کر کوئی تنظیم بنا لینی چاہیے، آپ اس کا اچھا سا نام تجویز کر لیں پھر بچوں کی تعلیم وتربیت کا کام بہتر انداز میں کرتے چلے

جائیں۔جس طرح بچوں کو مختلف تنظیموں کے ذریعے انہیں مختلف سرگرمیوں میں مصروف رکھا جانا چاہیے اسی طرح اساتذہ اور والدین کی بھی غیر سیاسی تنظیمیں ہونی چاہئیں جس میں وہ آپس میں مل کر علم وفکر کی نشوونما میں اپنا اجتماعی کردار ادا کرسکیں۔کسی موضوع یا مشکل کو اپنے سامنے رکھا جائے اور باہمی گفتگو کے ذریعے اس کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ایک اور بات بہت اہم ہے جو پاکستان میں نہ ہونے کے برابر ہے وہ یہ ہے کہ تعلیم میں بے شمار نقائص،خرابیاں اور پریشانیاں ہیں۔لیکن انہیں حل کون کرے گا؟ انہیں حل کرنے کے لیے جہاں ملکی اور حکومتی سطح پر کوششیں ہوتی ہیں وہاں خاندان کی سطح پر بھی ایک کوشش ضرور ہوسکتی ہے کہ خاندان میں جو پڑھے لکھے افراد ہیں،خصوصاً خواتین،وہ ایک ایسی تنظیم بنالیں جو یہ بات سوچے کہ ہمارے خاندان میں کتنے بچے پڑھنے والے ہیں،اور کتنے والدین ایسے ہیں جو اپنے بچوں کو تعلیم دے سکتے ہیں اور کتنے والدین ہیں جو اپنے بچوں کو تعلیم نہیں دے سکتے۔اور اس کے لیے پورے خاندان کی بنیاد پر ایک ایسی تنظیم یا کمیٹی بنالی جائے کہ جس میں فنڈ جمع ہوں۔اور جن بچوں کے پاس ذہانت تو ہے لیکن محض پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے پڑھ نہیں سکتے انہیں پڑھانے کا انتظام کیا جائے۔خاندان میں اس کا ادراک بہت آسانی سے ہوسکتا ہے کیونکہ محلے اور بستی میں ہر شخص،ہر شخص کے بارے میں نہیں جانتا کہ کون محتاج ہے لیکن خاندان کے افراد کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ واقعی کون غریب ہے اور کون غریب نہیں ہے۔تو خاندانی تنظیموں کے ذریعے سے اپنے خاندان کے بچوں کو علمی ترقی میں مدد دینا بہت ضروری ہے،اس میں ہر اعتبار سے فائدہ اور نیکی ہے۔

تعلیمی ادارے اور اہل محلّہ

کسی بھی علاقے میں رہنے والے افراد کی تعلیم کے لیے جہاں سرکاری طور پر تعلیمی ادارے بنائے جاتے ہیں،وہیں اہل بستی کو اپنی مدد آپ کے تحت تعلیمی ادارے بنانے چاہئیں،یا سرکاری ونجی تعلیمی اداروں میں فلاحی تنظیموں کے ذریعے ایسی سہولتیں فراہم کی جائیں جو تعلیمی عمل کو بہتر بناسکیں،پاکستان میں سرکاری وغیر سرکاری تعلیمی اداروں میں والدین اور اساتذہ کی تنظیمیں تو بنتی ہیں لیکن سوچ سمجھ کر مخلصانہ انداز میں بہت کم کام کیا جاتا ہے،ان تنظیموں کو مؤثر بنانے کی ضرورت ہے۔انہیں جہاں تعلیمی وسائل اور سہولتیں فراہم کرنے کے لیے اپنا کردار ادا کرنا چاہیے وہیں تعلیمی عمل کو بہتر بنانے اور بہتر رکھنے کے حوالے سے نگرانی،مشاورت اور فنی تعاون کو آگے بڑھانا چاہیے۔

سماجی تنظیمیں اور تعلیم وتربیت

دنیا بھر میں سماجی تنظیمیں جہاں کمزوروں،بیواؤں،مظلوموں کی مدد کرتی ہیں،ہنگامی حالات میں تعاون،ہسپتالوں سڑکوں کی تعمیر اور اس طرح کے بیسیوں کام کرتی ہیں وہیں معاشرے میں رہنے والے چھوٹے بڑے افراد کی تعلیم وتربیت کا کام بھی انجام دیتی ہیں۔ان کاموں میں کتاب،قلم،کمپیوٹر جیسے وسائل فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ،طالب علموں کی فیس اور نقل وحمل کی سہولتیں بھی فراہم کرتی ہیں۔اس کے علاوہ گاہے بہ گاہے تفریحی اور تعلیمی مقابلوں کا اہتمام کرکے معاشرے میں صحت مند سرگرمیوں کو فروغ دیتی ہیں۔پاکستان اور اس جیسے بعض ممالک میں این جی اوز کے بارے میں کوئی اچھا تصور نہیں پایا جاتا،کیونکہ بہت سی این جی اوز ایک خاص ایجنڈے کے تحت ملک وقوم کے وسائل سمیٹنے یا بہبود و ثقافت کے نام پر غیر اخلاقی،غیر اسلامی اور بعض تو غیر انسانی سرگرمیوں میں بھی ملوث پائی گئی ہیں۔اس لیے صحیح اور اچھی تنظیموں کے ذریعے اس تأثر کو زائل کیا جاسکتا ہے۔

کتب خانے،انٹرنیٹ کیفے

کتاب کی اہمیت کسی بھی دور میں کم نہیں ہوسکتی اور انٹرنیٹ،کمپیوٹرز بھی آج کے تعلیمی عمل میں لازمی جزو بن چکے ہیں،لیکن پاکستان اور اس جیسے بہت سے ممالک میں غربت،طبقاتی ناہمواری اور اس جیسے بہت سے مسائل کی وجہ سے ذہین بچے بھی تعلیم سے محروم رہتے ہیں۔اس حوالے سے ہر بستی میں ایک اچھی لائبریری اور انٹرنیٹ کیفے کی سہولت کے لیے غیر تجارتی اداروں اور تنظیموں کو کام کرنا چاہیے۔ان لائبریریوں

میں پرسکون انداز میں بیٹھ کر پڑھنے کی سہولتیں ہونی چاہییں۔ پاکستان میں پبلک لائبریریز کا ایک نیٹ ورک موجود ہے لیکن افراد میں کتاب پڑھنے کا شعور اور کتب خانوں میں مناسب تعداد میں مطلوبہ کتابیں نہ ہونے کی وجہ سے یہ ادارہ اپنی حیثیت کھو رہا ہے۔ اس حوالے سے اساتذہ، والدین، بڑی عمر کے سنجیدہ طلبہ، سیاسی اور سماجی تنظیموں کو آگے بڑھنا چاہیے اور اس مقدس کام کو بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

تعلیم وتربیت میں مسجد کا کردار

اسلامی معاشرے میں مسجد کی حیثیت ہمہ گیر اور ہمہ جہت ہے۔ یہ ذکر، نماز، تلاوت قرآن کا مرکز بھی ہے اور تعلیم وآگہی کا مقام بھی۔ یہ سماجی معاملات کو سلجھانے اور معاشرتی جھگڑوں کو نمٹانے کی جگہ بھی۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کی بنیاد رکھنے کے لیے مسجد کو پہلا مرکز بنایا۔ وہیں سے اذان اور نماز باجماعت کا اہتمام شروع ہوا، اور وہیں سے مسلم وغیر مسلم افراد کی ذہنی، فکری اور روحانی تربیت کا آغاز کیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل ابتدا ہی میں یہ حکم جاری فرما دیا تھا۔

عَلِّمُوْا اولادکم القراءۃ والکتابۃ فی مسجدِ حَیِّکم

اپنے بچوں کو لکھنا پڑھنا اپنی بستی کی مسجد میں سکھاؤ۔

آپؐ نے مملکت کے معاملات چلانے، جھگڑوں کے فیصلے کرنے، غیر مسلموں سے مذاکرات کرنے حتٰی کہ لشکر روانہ کرنے کے کام بھی مسجد نبوی میں کیے۔ لیکن بدقسمتی سے اپنوں اور غیروں کی سازشوں اور ناسمجھیوں کی وجہ سے مسجد صرف نماز اور تلاوت کی جگہ رہ گئی۔ حالانکہ جمعہ کی صورت میں ہفتہ وار تعلیم، اور پانچ وقت نماز باجماعت کی شکل میں مسلم معاشرے کے افراد کو باہم ملاقات کرنے اور حال احوال پوچھنے کا بہترین نظام مسجد کے قیام سے پورا کیا گیا۔ اس لیے مسجد کو اس کے اصل مقام کی طرف واپس لانے کی اشد ضرورت ہے۔ مسجد کی تعمیر میں ایسا نقشہ بنانا کہ مسجد کی عمارت ذکر کردہ مختلف سرگرمیوں کے لیے با آسانی استعمال ہو سکے۔ مسجد میں لائبریری، دارالمطالعہ، ڈسپنسری، شادی بیاہ اور غمی خوشی کے اجتماعات کے ہال، اجتماعات میں خورونوش کے اہتمام کے لیے مناسب بندوبست، بچوں، بڑوں اور خواتین کے لیے مختلف اوقات میں تربیتی اور تعلیمی پروگرام ان سب کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اس طرح مسجد مرجع خلائق بن جائے گی۔ اس غرض کے لیے مسجد کے امام اور خطیب کا پڑھا لکھا، کشادہ دل، سمجھدار اور انسان دوست ہونا ضروری ہے۔ لیکن افسوس کہ بیشتر مساجد کی صورت حال ایسی نہیں ہے۔ اقبال نے بجا طور پر کہا تھا

دل ملاّ گرفتار غمے نیست　　　　　نگاہے ہست در چشمش غمے نیست
ازاں بگر یختم از مکتب اُو　　　　　کہ در ریگِ حجازش زمزمے نیست

(ارمغان حجاز ۹۶)

تعلیم بالغاں کے مراکز

اسی طرح تعلیم بالغاں کا اہتمام بہت کم تعداد میں اور کیفیت میں ہو رہا ہے اس کو بہت زیادہ بڑھانا چاہیے۔ وہ افراد جو مختلف تعلیمی اداروں میں پڑھا رہے ہیں اگر ایک بات کا تہیہ کر لیں کہ اس سال میں نے دو ہفتے یا ایک ماہ بڑوں کی تعلیم کے لیے وقف کرنا ہے یا اپنی زندگی میں ہفتے میں دو دن یا ہفتہ میں ۵ گھنٹے ہی بڑوں کی تعلیم کے لیے وقف کرنا ہے۔ تو بے شمار بڑے طالب علم مل سکتے ہیں۔ بہت سے افراد ہیں جن کو تلاش ہے کہ کہاں سے انہیں علم کی روشنی میسر آئے لیکن خود ان کی طرف سے شرم وحیا اور جھجک اور نہ پڑھانے والے افراد یہ دونوں علم کی کمی کا سبب ہیں۔ جبکہ تعلیم کے لیے اللہ اور اس کے رسولؐ نے عمر کی کوئی حد یا قید نہیں رکھی اور انسانی دنیا میں بھی کوئی قید نہیں ہے علم ہمیشہ سیکھا جا سکتا

ہے۔اقبال رحمتہ اللہ علیہ نے کیا خوبصورت بات کہی ہے۔

جوہر انسان عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

(بانگ درا۲۳۴)

انسان کا جوہرِ علم کبھی ختم نہیں ہوتا اس کو فنا نہیں ہے، وہ محض اپنی غفلت کی وجہ سے آنکھ سے اوجھل ہو جاتا ہے۔کسی فرد کے اندر کی صلاحیت یا ہنر کو کسی بھی لمحے اجاگر کیا جا سکتا ہے اور ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ افراد نے پڑھنا لکھنا عمر کے آخری حصے میں شروع کیا اور بہترین چیزیں سیکھیں اور بہت آگے بڑھ گئے۔اس وجہ سے ان کی تعلیم و تربیت کے لیے بھی معاشرے کو ایک ایسا کردار ادا کرنا چاہیے اور آخری بات کہ معاشرہ کیا ہے؟ کیا معاشرہ کسی دوسری مخلوق کا نام ہے۔ہم خود ہی معاشرہ ہیں اور ہمیں خود ہی اپنے آپ کو، بچوں، بڑوں، مردوں اور خواتین کو سکھانا ہے۔باہم ایک دوسرے کو پڑھانے سکھانے کا جو کام بھی ہو سکتا ہے وہ ضرور کرنا چاہیے۔